تحسین بی بی

مسعود اشعر کے افسانوں میں سیاسی شعور

بیسویں صدی کا طلوع زندگی کی کئی مثبت اقدار اور جہد کے میلانات کو ساتھ لایا۔ بیسویں صدی سیاسی سطح پر پورے کرۂ ارض میں بڑی فکری اور جغرافیائی تبدیلیوں کی صدی تھی۔ یہ صدی معاشی، سیاسی اور ادبی تحریکوں کی صدی تھی۔ غلام و آقا، آجر و اجیر، ہاری و جاگیردار، مفلوک الحال اور سرمایہ دار جمہوریت پسند اور آمریت نواز سبھی باہمی کش مکش کا شکار تھے۔ سیاسی حوالے سے یہ دور انتہائی ہنگامہ خیز تھا۔

اردو افسانہ نگاری کا آغاز اسی دور میں ہوا جب برصغیر میں سیاسی سطح پر انقلاب رونما پذیر ہونے والے تھے۔ اردو افسانے میں سیاسی شعور کی رو شروع ہی سے جاری و ساری نظر آتی ہے اور جو اسی طرح موجودہ دور میں بھی افسانہ نگاروں کے ہاں پورے زور و شور سے جاری ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عبادت بریلوی کہتے ہیں:

> مختلف سیاسی معاملات و مسائل کو بعض افسانہ نگاروں نے بڑے سلیقے سے افسانوں کے سانچے میں ڈھالا تھا۔(۱)

کسی ملک کے سیاسی اور سماجی حالات ادب پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔ تحریکِ آزادی سے پہلے اور مابعد جو ادب تخلیق ہوا، اس پر اس وقت کی گہری سیاسی چھاپ نظر آتی ہے۔ مختلف ادوار میں ادیبوں نے سیاست کے تحت ادب تخلیق کیا۔ کیوں کہ ہر فن پارہ اپنے عہد کی سیاسی، معاشی، ثقافتی اور تہذیبی صورتِ حال سے ضرور متاثر ہوتا ہے اور تخلیق کار جن حالات میں جیتا ہے۔ انھی اثرات

کے تابع ہو کر ادب تخلیق کرتا ہے۔ ادیب یا فن کار سیاسی و سماجی رہنما نہیں ہوتا لیکن اس کی اہمیت کسی طرح بھی کسی مصلحِ قوم سے کم بھی نہیں ہوتی۔ وہ خلوصِ دل سے اپنی تخلیقات کے توسط سے قوموں کو بیدار کرتا ہے۔ اردو افسانے کا پورا تعمیری دور اور افسانوی روایت، ملک کی سماجی، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو افسانے میں سیاست اور سیاست دانوں کی غلطیوں، بدعنوانیوں کے خلاف نفرت کا اظہار کئی افسانہ نگاروں کے ہاں بالکل واضح نظر آتا ہے۔ کیوں کہ ادیب اپنے عہد کے لیے لکھتا ہے اور یہ اس کا اپنے ہم عصروں سے خطاب ہوتا ہے اور وہ اپنا ایک سیاسی یا سماجی نقطۂ نظر رکھتا ہے جس کا عکس اس کی تحریروں میں کہیں نہ کہیں ضرور نظر آتا ہے۔

ساٹھ کی دہائی پاکستانی معاشرے میں سماجی اور سیاسی دونوں حوالوں سے الجھنوں کا زمانہ ہے۔ اس دور میں لکھے گئے افسانے کو فرد کی کہانی قرار دیا گیا ہے جو خارج کے بجائے باطن کی غواصی کرتا ہے۔ پاکستانی افسانے کے رویّے کو سیاسی پس منظر سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ سیاسی سطح پر یہ دور قومی شناخت کی گم شدگی کا دور ہے۔ جدید دور کے افسانہ نگاروں کے ہاں دکھ درد، غربت و افلاس، محرومی، خودغرضی، ذہنی انتشار، عصبیت، سیاسی شعبدہ گری، جمہوریت کی حیلہ پردازی، آمریت کی سنگینی اور سیاسی شعور وغیرہ کا عکس واضح نظر آتا ہے۔ بقول شہزاد منظر:

> جدید افسانہ آج بھی ترقی پسند افسانے کی طرح اپنے دور کا ترجمان اور عکاس ہے اور اس میں بھی سیاسی جبر، سماجی ناانصافیوں، پامال عقائد، شکستہ اقدار اور فرسودہ نظامِ حیات کے خلاف شدید احتجاج پایا جاتا ہے۔(۲)

پاکستانی معاشرے کو غیر مستحکم سیاسی صورتِ حال اور طبقاتی نظام کی خرابیوں نے گوناگوں سیاسی، سماجی اور فکری مسائل سے دوچار کیا اور مارشل لا کی وجہ سے ابتر معاشرے میں ایک سیاسی اور فکری خلا پیدا ہو گیا۔ اس دور آمریت میں کئی ادیبوں بالخصوص بعض افسانہ نگاروں نے فوجی آمریت کو تسلیم نہیں کیا اور اس کے خلاف قلمی جہاد جاری رکھتے ہوئے علامتی و استعاراتی پیرایہ اختیار کیا۔ یوں اس دور میں افسانے کا اہم رجحان علامت نگاری ہے اور علامتی رجحان کی نمود کے حوالے سے سیاسی

سطح کی زبان بندی اور ترقی پسند تحریک کے تحت افسانے میں حقیقت پسندی کے رجحان سے انحراف کو بطور وجوہ پیش کرنے کی روش عام ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

> ہمارا علامتی افسانہ ایک طرف تو بے رحم حقیقت نگاری کی روش سے انحراف کا عمل تھا، دوسری طرف سیاسی جبر کی فضا میں سانس لینے کی ایک کاوش اور تیسری طرف شے، کردار یا کہانی کے بطن میں موجود پُراسراریت کا ادراک کرنے کے عالی رجحان سے منسلک ہونے کا ایک اقدام تھا۔(۳)

اس حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> علامت نگاری کا آغاز چھٹی دہائی سے ہوا۔ آمریت کے تحت جبر، گھٹن، قدغن اور احتساب کی عمومی فضا بھی اس کے فروغ کا ایک سبب بنی۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم بڑا محرّک ترقی پسند فکشن میں مقصدیت، حقیقت نگاری، واقعیت [پر زور]، استعارے سے پرہیز اور باطن سے احتراز کے خلاف ردِعمل کی صورت میں بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔(۴)

اردو کا جدید علامتی افسانہ بعض نفسیاتی، سیاسی اور معاشرتی وجوہات کے ساتھ ہی ہمارے ملکی واقعات، واردات اور تجربات سے پھوٹا ہے اور اس دور کے افسانوں میں دوسرا اہم رجحان سادہ بیانیہ اور نیم استعاراتی اسلوب ہے جس کو انفرادی سطح پر مختلف افسانہ نگاروں نے اختیار کرتے ہوئے سیاسی جبر، گھٹن اور نفسیاتی، ذہنی اور باطنی عوارض کی عکاسی کی ہے۔ مثلاً انتظار حسین نے داستانی علامتوں کو عصری بصیرت اور انور سجاد و خالدہ حسین نے سیاسی جبر اور بے سمتی کو تجریدی و علامتی انداز دیا ہے۔ اس کے علاوہ علامتی و تجریدی رجحان کے تحت لکھنے والوں میں منشا یاد، رشید امجد، اعجاز راہی، منیر شیخ، سمیع آہوجا، آغا سہیل، یونس جاوید، اسد محمد خاں، مسعود اشعر، مظہر الاسلام، سلیم اختر اور دوسرے بہت سے افسانہ نگار شامل ہیں۔

اس دور کی جدید نسل کے افسانہ نگاروں کی تحریروں میں مخصوص حالات کے تحت بڑی بے چینی، گھٹن نظر آتی ہے جو اپنے دور کے سیاسی اور سماجی حالات سے سرکشی کی ایک صحت مند

علامت ہے۔ مسعود اشعر کا شمار بھی جدید رجحان رکھنے والے ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ستّر کی دہائی میں اپنی شناخت بنالی تھی۔ وہ توانا فکر کے افسانہ نگار ہیں۔ مسعود اشعر ملکی و سیاسی حالات پر گہری نظر رکھنے والے ادیب ہیں اور ان کے افسانوں کے موضوعات بھی سیاست سے پیدا شدہ کرب اور معاشرتی رویوں کی عکاسی کرتے ہیں اور سیاسی شعور، مارشل لا کے جبر اور قید و بند کی مشکلات، علامتی و تجریدی انداز میں موجود ہیں۔ بقول ڈاکٹر اعجاز راہی:

> وہ معاشرتی مسائل کے ساتھ جب سیاسی مسائل پر اظہار خیال کرتے ہیں تو ان کا علامتی نظام ایک نئے سرے سے ترتیب پاتا ہے۔[۵]

مسعود اشعر کا پہلا افسانوی مجموعہ آنکھوں پر دونوں ہاتھ (۱۹۷۵ء) ان کی فکری اور نظریاتی جہت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں میں مسعود اشعر نے مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش میں ڈھل جانے کی صورت میں زمین کے گُم ہونے کے کرب و احساس کی عکاسی نہایت خوبی سے کی ہے۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

> پاکستان کو دو نہایت اہم اور نازک موڑوں سے بھی گزرنا پڑا ہے۔ ایک کا تعلق ۱۹۶۵ء میں ہندوستانی حملے کے خلاف جنگ سے تھا اور دوسرے کا ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکا کے المیے سے۔[۶]

سقوطِ ڈھاکہ کے المیے پر لکھی گئی مسعود اشعر کی کہانیاں اپنی ایک الگ شناخت رکھتی ہیں۔ ان میں ان کی وطن پرستی کے جذبات اور سیاسی شعور کا رجحان واضح نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے ان کے اہم افسانے ''درخت اور دروازے''، ''طیراً ابابیل''، ''کابوس''، ''دکھ جومٹی نے دیے''، ''اپنی اپنی سچائیاں''، ''ڈاب اور بیئر کی ٹھنڈی بوتل''، ''آنکھوں پر دونوں ہاتھ''، ''بیلا نائی رے جولدی جولدی'' وغیرہ ہیں۔

افسانہ ''دکھ جومٹی نے دیے'' سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے اہم افسانہ ہے۔ اس افسانہ کے پس منظر میں المیہ مشرقی پاکستان کے احساس کو جلاوطن کے احساس میں منتقل کرکے افسانے کو فکری اور اسلوبیاتی حسن سے ہم کنار کر دیا گیا ہے۔ افسانے میں بے زمینی ایک دُکھ کی صورت میں

پورے افسانے میں گردش کرتی ہے:

> کیڑے مکوڑے اپنے ماحول سے اپنا رنگ و روپ حاصل کرتے ہیں تاکہ دشمن کے حملے کے وقت زمین کے رنگ میں اپنے آپ کو چھپا سکیں... اور جو کیڑا زمین کے ہم رنگ نہیں ہوتا؟ وہ ہمیشہ خطرے میں رہتا ہے... مگر ایسا کیڑا غیر محفوظ ہو تو وہ پناہ کہاں تلاش کرے؟[۷]

سیاسی شعور کا غماز افسانہ ''اپنی اپنی سچائیاں'' میں بھی قومی تاریخ کے سب سے بڑے المیے کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ افسانہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے تضاد کو نمایاں کرتا ہے:

> یہ چیخیں عجیب ہیں کہ بھاری جوتوں کی دھمک اور جیپوں اور ٹرکوں کی گڑگڑاہٹ سے پیدا ہونے والے گھور سناٹے کو چیرتی اچانک ان کی آواز اُبھرتی ہے اور دفعتاً بند ہوجاتی ہے۔[۸]

افسانہ ''ڈاب اور بیئر کی ٹھنڈی بوتل'' میں استحصالی قوتوں کی چہرہ نمائی کی گئی ہے۔ اس افسانے میں ڈاب اور بیئر دونوں مشروبات کو مشرقی اور مغربی پاکستان کے سیاسی، معاشی و معاشرتی تضاد کو نمایاں کرنے کے لیے بطور علامت استعمال کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ المیہ مشرقی پاکستان کی حقیقت کی رُوداد کو بیان کرتا ہے:

> مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ سب لوگ مجھ سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ جیسے لانچ ایک نہیں دو ہیں اور ہم ایک لانچ میں سوار نہیں ہیں دو لانچوں میں سوار ہیں اور دونوں لانچیں مخالف سمت جا رہی ہیں۔[۹]

مشرقی پاکستان کے المیے کی بازگشت افسانہ ''آنکھوں پر دونوں ہاتھ'' میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس افسانے میں ایک مطالبہ اُبھرتا ہے کہ اس دھرتی کو صرف بیرونی ناظر کی آنکھ سے اور لاتعلقی سے نہ دیکھو بلکہ اس کے باسیوں کے مسائل جاننے کی کوشش کرو۔ یہ قبل از وقت خطرے کا الارم تھا کہ اس دھرتی کو فاتح کی نظر سے نہ دیکھا۔ یہ افسانہ مشرقی پاکستان کے ان جذبات کی عکاسی کرتا ہے جنھیں مسلسل روندا اور کچلا گیا ہے:

طوفان آجائے تو یہی کشتی مسافروں کو کنارے تک پہنچاتی ہے۔ مگر ایک
چھوٹی سی کشتی کتنے مسافروں کو کنارے تک پہنچا سکتی ہے۔؟(۱۱)

———

اپنی بے بسی کا احساس کر کے وہ خوف زدہ ہیں۔ میرے آس پاس تو پانی ہی
پانی ہے جو سارے نشان مٹا ڈالتا ہے۔(۱۲)

سیاسی شعور سے معمور افسانہ ''بیلا نائی رے جولدی جولدی'' میں روندے گئے بنگال کی فریاد کو موضوع بنایا گیا ہے جو صرف اپنوں کے سننے کے لیے ہے۔ اس افسانے میں دکھی کر دینے والی صورتِ حال کو علامتی انداز میں ایک پاگل بوڑھے کی زبانی سنایا گیا ہے کہ اس دیس میں سرمایہ داروں اور سامراج کے لیے عیاشیاں، سکھ و آرام سب کچھ ہے مگر غریب اور کوڑیوں کے مول بکنے والے انسان کے احساسات کا کسی کو بھی پاس نہیں ہے:

صبح ہونے سے پہلے مجھے یا تمھیں راستہ مل جانا چاہیے ورنہ کیا معلوم آنے
والی صبح کا سورج مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہو۔(۱۳)

یہ افسانہ مشرقی پاکستان میں ہونے والے فوجی ایکشن کی صورتِ حال کو بھی عیاں کرتا ہے۔ تو اس کے ساتھ ہی قاضی نذر الاسلام کی نظم کو اپنے افسانے کی بنیاد بنا کر خوب صورتی سے پیش کیا ہے جو مقبولیت کی وجہ سے وہاں قومی ترانے کی سطح پر پسند کی جاتی تھی۔

ان افسانوں کے علاوہ ''درخت اور دروازے''، ''طیراً ابابیل''، ''کابوس'' اور ''ٹوٹا پھوٹا گھر'' بھی اس ضمن میں اہم افسانے ہیں۔

مسعود اشعر نے افسانوی مجموعہ ''آنکھوں پر دونوں ہاتھ'' کے بیش تر افسانوں میں مشرقی پاکستان کی صورت حال کو بیان کیا ہے اور انھوں نے بیش تر ادیبوں کے برعکس اپنی طرف سے کوئی بھی خطا بنگالیوں کے سر نہیں ڈالی بلکہ ان کے افسانے ہمیں اس بات سے آگاہ کرتے ہیں کہ وہ بھی سچے تھے اور ہم بھی سچے تھے۔

۱۹۷۷ء میں جب جمہوریت کا سفر ایک نئے مارشل لا کی زد میں آیا اور اس گیارہ سالہ

مارشل لا نے جس بے سمتی اور منافقانہ رویے کو فروغ دیا، اس سیاسی جبریت اور آج کی صورتِ حال میں جنم لینے والے غیر دل چسپ احساسِ زندگی کو مسعود اشعر نے فن کارانہ انداز سے اپنے دوسرے افسانوی مجموعہ سارے فسانے (۱۹۸۷ء) میں بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے اس مجموعے میں شامل اہم افسانے ''بچھڑے کا گیت''، ''خواب''، ''سفر نامہ''، ''بتاشوں پر چلنے والی''، ''خوابوں کی زندانی''، ''خاموشی ۳، ۲، ۱'' اور ''ایک بڑی کہانی کا ورک نوٹس'' وغیرہ ہیں۔

مشرقی پاکستان کی علاحدگی کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے صدرِ پاکستان اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اقتدار سنبھالا۔ بھٹو باقی ماندہ پاکستان کے افسردہ لوگوں کے لیے ایک اُمید کی کرن تھے۔ کیوں کہ پیپلز پارٹی سوشلسٹ معیشت کا پرچار کرتے ہوئے ''روٹی، کپڑا اور مکان'' کے نعرے کے ساتھ میدان میں آئی تھی اور اس نعرے نے عوام میں بے حد مقبولیت حاصل کی تھی۔

۱۹۷۳ء میں ملک کے تیسرے آئین کا نفاذ ہوا۔ یہ دور پیپلز پارٹی کے عروج اقتدار کا عہد قرار دیا جا سکتا ہے۔ مارچ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں بدعنوانیوں اور دھاندلیوں کے الزامات کی وجہ سے ملک ایک بار پھر سیاسی بحران کا شکار ہو گیا۔ سیاسی تشدد اور پہیہ جام کا دور شروع ہوا جس کے نتیجے میں ۵/ جولائی ۱۹۷۷ء کو مارشل لا نافذ ہوا اور بھٹو حکومت کا خاتمہ ہو کر اقتدار ضیاء الحق کے ہاتھ میں آ گیا۔ ڈاکٹر صفدر محمود لکھتے ہیں:

۱۹۷۷ء میں مارشل لا نے قوم کی ساری آئینی جدوجہد کی نفی کر دی اور ملک
ایک بار پھر بے آئین ہو کر لاقانونیت کے اندھیرے میں ڈوب گیا۔(۱۴)

افسانہ ''بچھڑے کا گیت'' میں سیاسی شعور کی معنویت کو علامتی انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ ایک گھنے سایہ دار درخت کو کس طرح سے اوپر سے حکم ملنے پر کاٹا جا رہا ہے۔ یہاں پر درخت کے کاٹنے پر احتجاج کرنا دراصل ملک کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانے کا عمل ہے کہ ہمارے حکمران کس طرح سے امریکا کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں اور اپنے مفاد کے لیے ملک کو داؤ پر لگا دیتے ہیں اور امریکا سپر پاور ہونے کی وجہ سے پوری دنیا پر ظلم و بربریت کا پرچار کر رہا ہے:

چاروں طرف سے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ انسانی خون کی ارزانی کے خلاف

> احتجاج کرنے، وائٹ ہاؤس کی بدشکل سفید عمارت کے گرد پہرہ اور بھی سخت ہو گیا تھا اور خاردار تاروں کی باڑھ اور اونچی کر دی گئی تھی۔[۱۵]

اس افسانے میں ویت نام میں چھڑنے والی جنگ کا تذکرہ بھی خوب صورتی سے کیا گیا ہے اور ساتھ ہی جون بائیز ایک گیت گاتی ہے کہ وہ اپنی آزادی کی حفاظت نہ کر سکنے پر ذبح کر دیے جاتے ہیں۔

۱۹۷۷ء کا مارشل لا پوری قوم کے لیے ایک تازیانہ تھا جس کا ردِعمل مسعود اشعر کے افسانے ''خواب'' کی صورت میں ظاہر ہوا۔

مسعود اشعر کو زندگی سے خواب کے نکل جانے کا انتہائی دکھ ہے اور افسانہ ''خواب'' میں ان کے کرداروں کا ایک دوسرے سے یہ سوال کرنا کہ ''کوئی خواب دیکھا؟'' فرد کی اجتماعی صورتِ حال میں علاحدگی اور تنہائی کی عکاسی کرتا ہے۔ محکوم معاشروں میں بے اختیار ہوتے فرد کا خواب جب دیگر لوگوں کے ٹوٹے ہوئے خوابوں سے جُڑتا ہے تو یہ عصری صورتِ حال کے خوب صورت استعارے کی صورت میں سامنے آتا ہے:

> ہاں کیا خواب دیکھا رات...؟ ہر صبح پہلا سوال میں ہی کرتا ہوں... وہ تو ہمیشہ اچھے ہی خواب دیکھتی ہے۔ ایسے خواب جن سے سارا دن ہنسی خوشی گزر جاتا ہے۔[۱۶]

افسانہ ''خوابوں کے زندانی'' ۱۹۷۷ء کے مارشل لا کے حوالے سے لکھا گیا اہم افسانہ ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> طوفان جھکڑ دائرے میں گھومنے لگے تھے اور تیز وتُند بگولے نے ریت کے ذرّوں اور کاغذ کے پُرزوں کے ساتھ روشن آنکھوں اور تاریک دلوں کو بھی ایک ہی چکر میں گھیر لیا تھا۔[۱۷]

افسانہ ''بتاشوں پر چلنے والے'' میں مارشل لا کے جبر و استحصال اور سیاسی گھٹن کی نشان دہی کی گئی ہے:

> وہ بھی میرے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ اب میں اکیلا نہیں ہوں، تنہا نہیں ہوں۔ ایک ہجوم ہے میرے ساتھ جو دوڑ رہا ہے، ماتھے سے ٹپکتے پسینے کی بوند بتاتی ہے کہ میرے اندر گرمی آ گئی ہے اور اب یہ حرارت آگے بھی منتقل کی جا سکتی ہے۔[۱۸]

یہاں پر حرارت کی نشان دہی دراصل جبر اور استحصال کے خلاف افراد کی قوت مزاحمت کی نشان دہی کرتی ہے۔

مسعود اشعر نے ضیاء الحق کے دور آمریت کے خلاف احتجاج کے طور پر ''خاموشی'' کے عنوان سے تین افسانے تحریر کیے ہیں۔ یہ تینوں افسانے اگرچہ الگ الگ ہیں لیکن ان تینوں کا موضوع ''خاموشی'' یعنی مارشل لا و ضیا آمریت کے دور کی خاموشی ہے۔ ان افسانوں میں ضیا آمریت کا ذکر علامتی انداز میں کیا گیا ہے۔ افسانہ ''خاموشی ۱'' میں مارشل لا کے دوران جب سیاسی سرگرمیوں اور اخبارات پر کڑی پابندیاں عائد کی گئیں، کہیں سے بھی اس مارشل لا سے نجات حاصل کرنے کی تگ و دو کی خبر سننے کو نہیں مل رہی اور میدانِ سیاست میں قبرستان جیسی خاموشی طاری ہے۔ اس ساری صورتِ حال کی عکاسی نہایت عمدگی سے کی گئی ہے۔

آمریت کے باعث ملک کی صحیح صورتِ حال کا متلاشی افسانے کا مرکزی کردار جب اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی سب کی طرف سے مایوس ہوتے ہوئے کہتا ہے، ''جی چاہتا ہے، یہ سارا ریڈیو توڑ دوں اور سارے اخبار پھاڑ کر پھینک دوں۔''[۱۹]

افسانے میں بچے کا دودھ کے لیے رونا اور سورج کا نہ نکلنا بھی علامتیں ہیں۔ کمرے کی صفائی کے ذریعے بھی بلیغ اشارہ کیا ہے جس میں کمرہ ہمارا ملک اور معاشرہ ہے جہاں آمریت اور جابرانہ سیاسی اور اقتصادی نظام کی وجہ سے گندگی پھیلی ہوئی ہے۔ ''تم بھی عجیب آدمی ہو اتنے دن سے کہہ رہا ہوں یہ کمرہ صاف کر دو۔ تم سنتی ہی نہیں ہو۔''[۲۰]

افسانہ ''خاموشی۔۲'' میں بھی مارشل لا کے خلاف احتجاج کا رویہ واضح نظر آتا ہے۔ ''آخر تم چاہتے کیا ہو؟ وہ یک دم حملہ کرتا ہے۔ تمھیں بے بس کرنے کے لیے۔''[۲۱]

افسانہ ''خاموشی۔۳'' میں بھی علامتی انداز سے ضیا آمریت کے دوران جبریت اور سیاسی گھٹن کو موضوع بنایا گیا ہے:

> باہر سڑک سنسان ہے۔ کوئی گاڑی نہیں گزر رہی ہے، چاروں طرف خاموشی ہے، سنگین خاموشی... چوک پر ٹریفک سگنل تیزی سے جل بجھ رہے ہیں۔ وہ

اپنی ذمے داریوں سے آزاد ہو چکے ہیں کہ اب اپنی حفاظت تم خود کرو۔ (۲۲)

مسعود اشعر کے ہاں موضوعات کا تنوع ان کے افسانوی مجموعہ اپنا گھر میں نظر آتا ہے جس میں سیاسی شعور سے لبریز اہم افسانے ''برزخ''، ''نامحرم''، ''آخری نکھار''، ''بیسویں صدی کی آخری کہانی''، ''اکیسویں صدی کی پہلی کہانی'' اور ''اپنا گھر'' وغیرہ شامل ہیں۔

سیاسی شعور کے غماز افسانے ''برزخ'' میں پاکستان کے اندر برپا ہونے والی سیاسی ہلچل اور حکومتوں کا تذکرہ علامتی انداز سے کیا گیا ہے:

> وہ جلسے میں پہنچ جاتا ہے۔ بڑے بڑے سیاسی اور سماجی مفکر خطاب کر رہے ہیں۔ خلیج کی جنگ کے بعد اپنے ملک کی دفاعی اور اقتصادی حکمتِ عملی پر باتیں ہو رہی ہیں۔ اس جنگ کے بعد دنیا میں ابھرنے والی سپریم طاقت کے عزائم کا مقابلہ کرنے پر غور کیا جا رہا ہے۔ سپر پاور کی حیثیت سے سوویت یونین کے خاتمے کا ماتم کیا جا رہا ہے۔ ملک کے اندر استحصالی طاقتوں کی نئی سازشوں کو بے نقاب کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ (۲۳)

یہاں پر مصنف اس اہم نکتے کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ ہم تو پچاس برس سے لے کر آج تک ایسی ہی باتیں سنتے آ رہے ہیں۔ اگر باتوں سے انقلاب آنا ہوتا تو اب تک کئی انقلاب آ چکے ہوتے۔ یعنی یہ سامراجی طبقہ صرف باتوں تک ہی محدود ہے عمل کوئی نہیں کرتا جو بھی اقتدار کی کرسی پر بیٹھتا ہے، اپنی ہی تجوریاں بھرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

مسعود اشعر نے سیاست سے پیدا شدہ کرب اور ملک کے اندر سیاسی حالات کی ابتری کا ذکر افسانہ ''نامحرم'' میں خوب صورتی سے کیا ہے۔ اس افسانے میں فوجی حکومت بالخصوص مارشل لا کی وجہ سے ملک میں پھیلے سیاسی جبر کی عکاسی بغیر کسی علامتی انداز کے براہِ راست کی گئی ہے:

> پھر ملک کے اندر بھاری بوٹوں کی دھمک اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ڈیڑھ دو سو سال سے لوگ جن مکروہ شکل بوٹوں کو ایک عارضی زبان سمجھ کر برداشت کر رہے تھے۔ ان بوٹوں نے قد نکالنا شروع کر دیے۔ ساری دنیا اُتھل پتھل ہو گئی، نوے دن نوے برسوں میں بدلنے لگے۔ بڑی بڑی سیسہ پلائی دیواریں گرنے لگیں، جس شخص کا قد ان بوٹوں سے ذرا سا بھی نکلتا نظر آتا ان کے سر قلم کیے جانے لگے، آنکھوں کانوں پر قفل لگنے لگے اور دماغوں پر شکنجہ سخت کیا جانے لگا، اب ہر شخص ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتا، کچھ بولنا چاہتا، لیکن دوسرے شخص کی کٹی زبان دیکھ کر خاموش ہو جاتا۔ (۲۴)

افسانے میں موجود تمام کردار اپنے اردگرد پھیلے ہوئے سیاسی و معاشرتی جبر اور پابندیوں سے بغاوت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

افسانہ ''آخری نکھار'' میں چاغی اور پوکھران کے ایٹمی دھماکوں کی صورت میں خطے میں موت چاروں طرف گردش کرتی نظر آتی ہے اور پہاڑ ان دھماکوں سے سفید ہو کر پیلے ہو جاتے ہیں:

> ہماری دھرتی اپنے نکھار پر آ کر واپس کومل سر پر جانا بھول گئی ہے۔ بارہ کومل سر پر خود ہی جانا نہیں چاہتی وہ ہم سے بدلہ لے رہی ہے اپنی بے حرمتی کا، ہم نے پہلے جنگل اجاڑ کر اسے ننگا کیا اور اس کی کوکھ سے یورنیم نکال کر اس میں ہزاروں لاکھوں ٹن بارود بھر رہے ہیں۔ (۲۵)

افسانہ ''اکیسویں صدی کی پہلی کہانی'' میں دنیا میں سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی سطح پر ہونے والی ترقی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں امریکا کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا ذکر بھی کیا ہے۔ افسانے کی ابتدا بین الاقوامی معاشی اجارہ داریوں اور استحصال کی غرض سے بڑی بڑی کمپنیوں کے ادغام کے ذکر سے ہوتی ہے:

> امریکا آن لائن اور ٹائم وارنر ایک ہو گئے ہیں اور انھوں نے ای ایم آئی بھی خرید لیا ہے۔ بیچم، ویلکم اور گلیکسو بھی آپس میں مل گئے ہیں۔ (۲۶)

سیاسی شعور سے لبریز ایک اور افسانے ''اپنا گھر'' میں ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں، مسئلۂ کشمیر اور ہندو مسلمانوں کے جھگڑوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ یہاں مسعود اشعر نے ملک میں سر اٹھانے والی بدعنوانیوں، لوٹ مار اور حکمرانوں پر بھی طنز کیا ہے۔ ''آپ کے ملک کی وجہِ شہرت تو سیاسی لیڈروں

کی لوٹ مار اور کرپشن ہے۔"(۲۷)

مسعود اشعر نے تقسیمِ ہندوستان کے بعد سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر پروان چڑھنے والی بے سمتی، کرب کی کیفیات کو بڑی خوبی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے علامتی طریقِ اظہار کو سنجیدگی سے قبول کرتے ہوئے افسانے میں علامت نگاری اور بیانیہ طرزِ احساس کے ذریعے تاثر پیدا کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر اعجاز راہی:

> مسعود اشعر کا افسانوی خمیر تہذیبی و مذہبی علامتوں سے اٹھتا ہے۔ چنانچہ علامتوں کا ماورائی آہنگ افسانے میں خوابیدگی کی ایک صورتِ حال کو ابھارتا ہے۔(۲۸)

مسعود اشعر کی علامتیں زیادہ تر اپنے عہد سے متعلق ہونے کے ساتھ ہی مذہبی و تہذیبی تسلسل سے بھی وابستہ ہیں۔ انھوں نے تلمیح اور محاکات، پیکر تراشی کا استعمال بھی اپنے افسانوں میں نہایت خوبی سے کیا ہے۔ مسعود اشعر کم لکھتے ہیں لیکن جب لکھتے ہیں تو بڑی ہنرمندی سے لکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی اپنی مخصوص فضا ہوتی ہے جس میں ان کے عمدہ اسلوب کا بڑا ہاتھ ہے۔

مسعود اشعر کے افسانے آج کے ادبی مذاق سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ مستقبل کے افسانہ نگاروں کے لیے ایک روشن مثال بھی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ عبادت بریلوی، افسانہ اور افسانے کی تنقید، (لاہور: ادارۂ ادب و تنقید، ۱۹۸۶ء)، ص ۱۷۳۔
۲۔ شہزاد منظر، جدید افسانہ اور عصری آگہی مشمولہ جدید اردو افسانہ، (کراچی: منظر پبلی کیشنز، ۱۹۸۲ء)، ص ۸۲۔
۳۔ وزیر آغا، دائرے اور لکیریں، (لاہور: مکتبۂ فکر و خیال، ۱۹۸۶ء)، ص ۱۴۳۔
۴۔ سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص ۶۸۲۔
۵۔ اعجاز راہی، اردو افسانے میں علامت نگاری، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء) ص ۲۶۵
۶۔ فرمان فتح پوری، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)، ص ۶۳۔
۷۔ مسعود اشعر، دکھ جو مٹی نے دیے مشمولہ سارے فسانے، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء)، ص ۶۷-۳۶۶

۸۔ ایضاً، ص ۳۸۲۔ ۹۔ ایضاً، ص ۴۰۱۔ ۱۰۔ ایضاً، ص ۴۱۴۔
۱۱۔ ایضاً، ص ۴۱۵۔ ۱۲۔ ایضاً، ص ۴۲۷۔
۱۳۔ صفدر محمود، پاکستان: تاریخ و سیاست، (لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۸۶ء)، ص ۹۴۔
۱۴۔ مسعود اشعر، سارے فسانے، ص ۲۲۔
۱۵۔ ایضاً، ص ۲۵۔ ۱۶۔ ایضاً، ص ۲۲۔ ۱۷۔ ایضاً، ص ۷۶-۷۵
۱۸۔ ایضاً، ص ۱۲۲۔ ۱۹۔ ایضاً، ص ۱۲۹۔ ۲۰۔ ایضاً، ص ۱۳۲۔
۲۱۔ ایضاً، ص ۱۳۹۔ ۲۲۔ ایضاً، ص ۲۱۔ ۲۳۔ ایضاً، ص ۲۷۔
۲۴۔ ایضاً، ص ۱۴۴۔ ۲۵۔ ایضاً، ص ۱۶۰۔ ۲۶۔ ایضاً، ص ۲۱۰۔
۲۷۔ ایضاً، ص ۲۱۴۔
۲۸۔ اعجاز راہی، اردو افسانے میں اسلوب کا آہنگ، (راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء) ص ۱۶۶۔

مآخذ

۱۔ اختر، سلیم، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔
۲۔ اشعر، مسعود، سارے فسانے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء۔
۳۔ ______، اپنا گھر، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء۔
۴۔ آغا، وزیر، دائرے اور لکیریں، لاہور: مکتبۂ فکر و خیال، ۱۹۸۶ء۔
۵۔ بریلوی، عبادت، افسانہ اور افسانے کی تنقید، لاہور: ادارۂ ادب و تنقید، ۱۹۸۶ء۔
۶۔ راہی، اعجاز، اردو افسانے میں علامت نگاری، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔
۷۔ ______، اردو افسانے میں اسلوب کا آہنگ، راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء۔
۸۔ فتح پوری، فرمان، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء۔
۹۔ محمود، صفدر، پاکستان: تاریخ و سیاست، لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۸۶ء۔
۱۰۔ منظر، شہزاد، جدید افسانہ اور عصری آگہی مشمولہ جدید اردو افسانہ، کراچی: منظر پبلی کیشنز، ۱۹۸۲ء۔